اقبال اور تحریکِ پاکستان

از

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی

۱۹۶۷ء

اقبال اور تحریکِ پاکستان (۱)

۱۹۳۵ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ وضع کرنے کے لئے لندن میں تین مرتبہ گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا۔ اور جب یہ تینوں کانفرنسیں ختم ہوگیئں تو پارلیمنٹ کے دارالعوام اور دارالامراء کی ایک Joint Select Committee مقرر کی گئی تھی۔ جس نے اس ایکٹ کی ترتیب، تدوین و تصنیف میں حصّہ لیا۔ گول میز کانفرنس کے جو ڈیلی گیٹ ہندوستان سے بھیجے جاتے تھے ان میں ہندوستان، مسلمان، سکھ، اچھوت، یورپین ہندوستانی مسیح اور والیان ریاست سب کے نمائندے شامل تھے۔ ان مندوبین کا انتخاب ہندوستان کا وائسرائے اور Secretary of State for India یعنی وزیرِ ہند باہمی مشورے سے کرتے تھے۔ پہلی گول میز کانفرنس کا افتتاح ۱۲ ستمبر ۱۹۳۰ء کو ہوا تھا۔ اس میں ہندوستانی مسلمانوں کے جو نمائندے بھیجے گئے تھے، ان میں قائداعظم محمد علی جناح شامل تھے لیکن علامہ اقبال شامل نہیں تھے۔ دوسری گول میز کانفرنس ستمبر ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔ اس میں قائداعظم جناح اور علامہ اقبال دونوں شامل ہوئے۔ جب تیسری گول میز کانفرنس کے انعقاد کا وقت آیا۔ تو وائسرائے نے مسلمان مندوبین کی جو فہرست منظوری کے لیے وزیرِ ہند کو لندن بھیجی، اس میں مسٹر جناح اور علامہ اقبال کے نام درج تھے۔ لیکن وزیرِ ہند Sir Samuel Hoare نے، جو بعد کو Lord Templewood کے لقب سے مُلقّب ہوئے تھے، یہ دونوں نام منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ جناح کے متعلق سر سیموئل ہور کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ پچھلی دونوں کانفرنسوں میں اس شخص کا رویہ تعمیری نہیں بلکہ تخریبی رہا ہے۔ اور ہم لوگ ہندوستان کے لیے جس آئین اور دستور کی عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں اور جس کی تعمیر کے لیے یہ ساری دوڑ دھوپ اور تگ و دو ہو رہی ہے، اُس عمارت کے بنانے میں جناح نے ایک اینٹ اپنے ہاتھ سے نہیں رکھی۔ اس کے برعکس جو تجویز بھی پیش کی جاتی تھی۔ جناح اس پر شدت سے نکتہ چینی کرتا تھا لیکن خود اپنی طرف

سے کوئی متبادل یا موزوں یا معقول تجویز پیش نہیں کرنا۔ مسٹر سیموئل ہور نے یہ بھی کہا کہ جناح کے خیالات میں ایک ایسا الجھاؤ ہے جسے ہم سمجھنے سے معذور ہیں اور ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ جناح کے نام کو نامنظور کرنے کی دوسری وجہ، سر سیموئل ہور نے یہ بیان کی کہ جناح نے چونکہ ہندوستان کی اقامت ترک کر کے لندن میں اپنا مکان خرید لیا ہے اور پریوی کونسل میں پریکٹس شروع کر دی ہے لہٰذا اب اُسے ہندوستان کی نیکی بدی اور برائی بھلائی سے بظاہر کوئی دلچسپی نہیں۔

اقبال کا نام نامنظور کرنے کی وجہ وزیر ہند نے یہ پیش کی کہ پچھلی کانفرنس میں اقبال بالکل خاموش اور چپ چاپ، تماشائی کی حیثیت سے بیٹھا رہا ہے اور کسی بحث میں اس نے حصہ نہیں لیا۔ ایسے خاموش، بے زبان اور کم سخن شخص کو دوبارہ گول میز کانفرنس کے لیے بلانا بالکل بے کار ہے۔ ہمیں ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو آئین، دستور اور قانون وضع کرنے کی بحثوں میں حصہ لیں اونچ نیچ خود بھی سمجھیں اور ہمیں بھی سمجھائیں۔ اور جس کانسٹی ٹیوشن کا خاکہ ہم تیار کر رہے ہیں، اس میں اگر ہماری رہنمائی نہیں کر سکتے تو کم سے کم امداد تو ضرور کریں۔

وزیر ہند کے ان اعتراضوں کے جواب میں، وائسرائے نے دوبارہ لکھا کہ جناح اور اقبال کو تیسری گول میز کانفرنس میں ضرور شریک کرنا چاہیے۔ جناح نے اگر لندن میں رہائش اختیار کر لی ہے یا پریوی کونسل میں پریکٹس شروع کر دی ہے تو اس طرح اس کی نمائندہ حیثیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ وہ آج بھی آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر ہے اقبال کے متعلق وائسرائے نے وزیر ہند کو لکھا کہ آپ کو غالباً اس بات کا اندازہ نہیں کہ آج اقبال ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کا روحانی، معنوی اور سیاسی پیشوا ہے۔ بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کا نوجوان طبقہ تو اقبال کا پرستار ہے۔ جس جلسے میں بڑی بڑی مرصع اور پرجوش تقریریں ناکام رہ جائیں، وہاں اقبال کا ایک شعر کام کر جاتا ہے۔ مسلمانوں کو اقبال سے جو عقیدت ہے ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ مسلمان اپنے کسی قومی اجتماع کو اس وقت تک اپنی نمائندگی کا پروانہ عطا نہیں کرتے، جب تک اقبال اس اجتماع کو اپنی شرکت کا فخر نہ بخشے۔ لہٰذا اقبال گول میز کانفرنس میں زبان کھولے یا چپ رہے تقریریں کرے یا ہونٹوں پر مہر سکوت لگا کر بیٹھا رہے، اس کی شرکت مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے ضروری ہے۔

وائسرائے کی اس گذارش کے باوجود Secretary of State نے جناح کا نام منظور کرنے سے انکار کر دیا اور انھیں تیسری گول میز کانفرنس میں مدعو نہیں کیا اور نہ آئندہ Joint Select Committee میں بلایا۔ البتہ اقبال کے بارے میں وزیر ہند کو اپنی رائے تبدیل کرنا پڑی اور انھیں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت بھیج دی گئی۔ چنانچہ علامہ اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں جو نومبر ۱۹۳۲ء میں ہوئی تھی، لندن تشریف لے گئے تھے۔

جناح کی سیاسی زندگی کا یہ سب سے تاریک دور تھا۔ ہندوستان میں اس کے لیے بظاہر کوئی جگہ باقی نہیں

رہی تھی۔ لارڈ ولنگڈن وائسرائے تھے جن سے جناح کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔آل انڈیا مسلم لیگ ایک بے روح اور مردہ جماعت بن گئی تھی۔جس کی لاش پر گدھ منڈلا رہے تھے۔مسلمانوں کی ساری سیاست آل انڈیا مسلم کانفرنس کے ہاتھ میں چلی گئی تھی ،جس کے کرتا دھرتا سر فضل حسین اور آغاخان تھے ۔ سر فضل حسین وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں بیٹھ کر ایک بہت بڑے چابکدست شاطر کی طرح سیاست کی شطرنج کھیل رہے تھے ، اور اپنے مہروں کو ادھر سے اُدھر حرکت دینے میں مصروف تھے۔ لندن میں آغاخان ، گول میز کانفرنس کے لیڈر کی حیثیت سے ، اپنی عظیم الشان ، شخصیت اور اپنے اثر و رسوخ کے کارنامے دکھا رہے تھے۔اس کے علاوہ اس زمانے میں یوں بھی مسلمانوں کو جناح سے بہت سی بدگمانیاں تھیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ شخص مخلوط انتخاب کا حامی ہے ،۱۹۲۶ء کی تجاویز دہلی کا موجد ہے سائمن کمیشن کا مخالف ہے اور کسی حد تک نہرو رپورٹ کا بھی طرف دار ہے لہذا مسلمانوں کے مفاد اس کے ہاتھ میں محفوظ نہیں ہو سکتے۔

جناح کی بے بسی کا اگر آپ اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو وزیر ہند ، سر سیموئل ہور کے یہ الفاظ سنیے۔جو انھوں نے گول میز کانفرنس کے مسلمان مندوبین کا ذکر کرتے ہوئے جناح کے متعلق لکھے ہیں :-

"As Jinnah sat with them, it might have been imagined that he would give the lead to his delegation. It is true that he intermittently took a prominent part in the debates, but many of us could never follow the movements of his volatile mind. He never seemed to wish to work with any one. Was he in favour of All-India Federation ? We could not tell for certain, though it is worth remembering that he never then suggested the division of India and the creation of Pakistan. Was he in favour of Provincial Autonomy without change in the Centre? Some times he gave us the impression that he did not wish to go beyond provincial autonomy, and at other times, that he demanded responsible government both in the Centre and in the Provinces. It was this elusiveness that made it difficult for us to cooperate with him, or for him to give any clear lead to his Moslem Colleagues."

سر سیموئل ہور کے ان الفاظ کے پیچھے ایک بڑی لمبی اور اندوہناک داستان ہے ، جس کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ آپ میں سے جن حضرات کو سیاسیات سے دلچسپی ہے ، میں ان سے عرض کروں گا کہ وہ ۱۹۲۶ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک کے واقعات کا بغور مطالعہ کریں۔اس طرح انھیں اس تلخ حقیقت کا حال معلوم ہو جائے گا جس کا جناح اس وقت شکار تھا۔

اس تلخ حقیقت نے جناح کو مجبور کیا کہ وہ ہندوستان سے نقل مکانی کر کے انگلستان چلے جائیں۔ جہاں انھوں نے لندن میں Hampstead کے علاقے میں اپنا مکان خرید لیا تھا اور King's Bench Walk میں اپنا دفتر قائم

کر کے پریکٹس بھی شروع کر دی تھی۔ شاید ان کا ارادہ یہی تھا کہ بقیہ زندگی انگلستان ہی میں بسر کریں گے۔

فروری ۱۹۳۶ء میں جب مسٹر جناح، مسجد شہید گنج کا قضیہ چکانے کے لیے لاہور تشریف لائے تھے تو انھیں خوش آمدید کہنے کے لیے لاہور کے ٹاؤن ہال میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا تھا، جس کی صدارت لاہور کے لارڈ بشپ نے کی تھی۔ اس جلسے میں ہندو، مسلمان، سکھ، مسیحی، سب قوموں کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔ پنڈت نانک چند بیرسٹرایٹ لاء نے جو اس وقت پنجاب کی لیجسلیٹو کونسل میں ہندو پارٹی کے لیڈر تھے اور گول میز کانفرنس میں بھی شرکت کر چکے تھے، مسٹر جناح کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔

"Our country requires at the moment the boldest of her leaders, and Mr. Jinnah is one of them. At the Round-Table Conference his independence and boldness was not liked by the die-hards and even by some of the leaders of his own community, but he boldly stuck to them with a rare courage till he found himself to be a solitary man in the wilderness"

جواب میں، قائد اعظم نے جو تقریر کی تھی، اس میں ایک جگہ انھوں نے یہ فرمایا تھا:

"My friend Pandit Nanak Chand has referred to the Round-Table Conference. I was perhaps the most individualist member of the Conference. I displeased the Muslims because of the Joint Electorates. I displeased my Hindu friends because of the Fourteen Points. I displeased the Princes because I was deadly against their under-hand activities and I displeased the British Parliament because I felt right from the beginning and I rebelled against it and said that it was a fraud. Within a few weeks I did not have a friend left there."

آپ اس سے اندازہ کر لیجیے کہ جو شخص گول میز کانفرنس کو ایک fraud سمجھتا تھا، اسے اگر برطانوی حکومت نے تیسری گول میز کانفرنس اور Joint Select Committee میں ڈیلی گیٹ بنا کر مدعو نہیں کیا تھا تو کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ رنجش، بدگمانی، بے اعتمادی دونوں طرف تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب اپنے اور بیگانے دونوں اس خیال میں مگن تھے کہ جناح ختم ہو چکا ہے۔ اس کا کوئی سیاسی مستقبل نہیں۔ اس کی لیڈری کو نہ مسلمان تسلیم کرتے ہیں، نہ انگریز مانتے ہیں اور نہ ہندو قبول کرتے ہیں۔

آج کے مؤرخ کے لیے یہ تحقیق اور تفتیش کا ایک نہایت دلچسپ موضوع ہے کہ وہی جناح جس کی سیاست اپنوں اور غیروں دونوں کے نزدیک ختم ہو چکی تھی۔ اور جو Hamstead کی پہاڑی پر غریب الوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا اور جو King's Bench Walk کے پینتیس نمبر کے دفتر میں ایک بیرسٹر کی حیثیت سے پریکٹس کرتا تھا، وہی شخص صرف تین سال کے اندر مسلمانوں کا قائد اعظم بن گیا جسے مدارس سے لے کر پشاور تک پورے برعظیم کے مسلمانوں

نے اپنا نجات دہندہ تسلیم کر لیا، جس کی آواز کو ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی متفقہ آواز مان لیا گیا اور جس کی مسیحا نفسی نے آل انڈیا مسلم لیگ کے تن مردہ میں جان ڈال کر اسے مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کروا کے چھوڑا۔

یہ ایک ایسی اونچ نیچ اور نشیب و فراز اور اتار چڑھاؤ اور ناکامیوں اور کامرانیوں کی لمبی کہانی ہے جس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ صرف مولانا شبلی مرحوم کا یہ شعر سن لیجئے ؎

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل جائے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

مسٹر جناح ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو اپنی غریب الوطنی کا زمانہ ختم کر کے واپس ہندوستان آئے اور انھیں مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کا ممبر منتخب کر لیا گیا۔ مسٹر جناح برطانوی حکومت کے خلاف تو ہمیشہ رہے اور ان کے اسی رجحان کے باعث اُن کو Nationalist مُسلمانوں کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن جس قدر Anti-British بن کر وہ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں انگلستان سے واپس آئے تھے اس کی مثال غالباً پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔ وہ اس عزم صمیم کے ساتھ واپس وطن تشریف لائے تھے کہ بہت جلد ہندوؤں اور مسلمانوں یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ کانگرس اور مسلم لیگ میں اتحاد پیدا کر کے، برطانوی حکومت کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کریں گے اور اپنے اس عزم صمیم کا مظاہرہ انھوں نے جس جوش و خروش سے مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی میں کیا۔ اس کی شہادت ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء کا ریکارڈ دے سکتا ہے۔

اسمبلی کے اسی ریکارڈ کو دیکھ کر، آکسفورڈ کے پروفیسر Coupland نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

"Never before, in fact, had the Nationalist Opposition pressed the Government so hard as it did in this brief period of Hindu-Muslim cooperation. Of the fourteen occasions on which "Certification" was employed between 1921 and 1940, eight occurred in and after 1935. This political concordat was mainly a matter of politics at Delhi. No appeal for communal peace and harmony was made by the Hindu or Muslim leaders to the country at large. Though the two communities were now confronted with the immediate prospect of full responsible government in the Provinces and the promise of its partial introduction at the Centre, yet there was no such marked increase of communal tension as there had been at previous stages of constitutional advance."

جوں جوں ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت آئین کے نفاذ کا وقت قریب آ رہا ہے، ہندوستان میں سیاسی سرگرمیاں تیز ہو رہی تھیں۔ کانگرس نے بڑی ردوکد کے بعد صوبائی اسمبلیوں میں اپنے نمائندے بھیجنے کا فیصلہ

کیا تھا۔ اور اس غرض کے لیے ایک آل انڈیا پارلیمنٹری بورڈ بھی وضع کیا گیا تھا، جس کے ذمے یہ کام تھا کہ صوبائی اسمبلیوں کے لیے موزوں کانگرسی امیدواروں کا انتخاب کرے۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے دو حصے تھے۔ ایک حصے کا تعلق صوبائی اسمبلیوں سے تھا اور دوسرے حصے کا تعلق پورے ہندوستان میں ایک فیڈریشن کے قیام سے تھا۔

صوبائی اسمبلیوں کی اہمیت اس خیال سے اور بھی بڑھ گئی تھی کہ آئندہ فیڈریشن کے مرکزی اسمبلی کے ممبروں کا انتخاب انہی صوبائی اسمبلیوں کے ذمے تھا۔ اس سے ظاہر ہے ان اسمبلیوں میں جس جماعت کے ارکان کی اکثریت ہوگی وہی جماعت فیڈرل اسمبلی میں بھی اپنے نمائندے بھیج سکے گی۔ کانگرس کی ہمہ گیر اور زوردار تنظیم کے پیش نظر یہ کہنا چنداں مشکل نہیں تھا کہ آئندہ صوبائی اسمبلیوں میں کانگرسی ممبروں کی بہت بڑی تعداد داخل ہوگی اور آئین کو کامیاب یا ناکام بنانے کی ذمہ داری گویا ایک حد تک انہی ممبروں کے سر عاید ہوگی۔

مسلمانوں میں اس قسم کا کوئی مرکزی اور وسیع الاثر یا ہمہ گیر ادارہ نہیں تھا جو کانگرس کی مانند ہندوستان کی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کی نگرانی کر سکے یا ان اسمبلیوں میں بھیجنے کے لیے موزوں مسلمان امیدواروں کا انتخاب کرے۔ یہ صحیح ہے کہ مسٹر جناح کے انگلستان سے واپس آنے کے بعد مسلم لیگ میں کچھ حرکت پیدا ہوگئی تھی، لیکن چونکہ لیگ نے اپنی گذشتہ تیس سال کی زندگی میں کبھی براہ راست انتخابات میں حصہ نہیں لیا تھا، اس لیے مسٹر جناح اس تذبذب میں تھے کہ لیگ کے تحت ایک پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ لیگ کے علاوہ مسلمانوں کی اور کوئی جماعت ایسی نہ تھی جو ہندوستان بھر میں اپنا اثر و رسوخ رکھتی ہو۔

آخر کار، جب بعض مختلف خیالات رکھنے والے لوگوں نے مسٹر جناح سے بار بار درخواست کی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو منظم کرنے اور انہیں ایک پالیسی کے تحت لانے کے لیے اس موقع پر مسلم لیگ کا انتخابات میں شریک ہونا ضروری ہے تو ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں، جو سر وزیر حسن کے زیر صدارت بمبئی میں منعقد ہوا تھا۔ ایک قرار داد منظور کی گئی کہ مسٹر جناح کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات لڑنے کے لیے، اپنی صدارت میں، ایک مرکزی الیکشن بورڈ کا قیام عمل میں لائیں، جس کے ارکان کی تعداد کم از کم پینتیس ہو اور اس بورڈ کو اختیار حاصل ہو کہ ہر صوبے کے مقامی حالات کے پیش نظر مختلف صوبوں میں پراونشل الیکشن بورڈ قائم کر کے ان کا الحاق مرکزی بورڈ سے کرے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی تاریخ میں یہ قرار داد گویا ایک سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ اس سے پہلے مسلم لیگ عملاً ایک Debating Society کی حیثیت رکھتی تھی جس کا سال میں ایک دفعہ کسی بڑے شہر میں اجلاس ہوتا تھا، جہاں پریذیڈنٹ اپنا خطبۂ صدارت پڑھتا تھا اور چند ریزولیوشن پاس کر دیئے جاتے تھے۔ مسلم لیگ نے کانگرس کی طرح کبھی کوئی عوامی تحریک نہیں چلائی تھی۔ مسلم لیگ کی ممبرشپ بھی عوامی نہ تھی بلکہ خواص تک محدود

تھی۔ مسلم لیگ نے کبھی پراونشل کونسلوں یا سنٹرل اسمبلی کے انتخابات میں اپنے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے نہیں کیے تھا۔ مسلم لیگ نے کبھی سنٹرل اسمبلی یا کسی پراونشل کونسل میں اپنی الگ پارٹی نہیں بنائی تھی۔ اس لیے بلاتکلف یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک عوام کا تعلق ہے، لیگ کا وجود یا عدم وجود برابر تھا۔ چنانچہ جب آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء کو بمبئی میں یہ قرارداد منظور کی تو ہندوستان کے اکثر صوبوں کے مسلمان رہنماؤں نے مایوسی اور افسوس کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح انتخابات کے اکھاڑے میں اترنے کے بعد مسلم لیگ اپنی وہ نمائندہ، ہمہ گیر اور اجتماعی حیثیت کھو بیٹھے گی، جو اسے مسلمانان ہند کے ایک متحدہ پلیٹ فارم کی صورت میں حاصل تھی۔ اس قسم کے لوگوں میں بعض چوٹی کے مسلمان لیڈر شامل تھے۔ مثلاً بنگال میں مولوی فضل الحق تھے جو اپنے صوبے میں پرجا پارٹی کے نام پر الیکشن لڑنے کی تیاری کر رہے تھے۔ پنجاب میں سر فضل حسین تھے جو یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یوپی میں نواب چھتاری اور محمد یوسف تھے جنہوں نے National Agriculturist Party بنا رکھی تھی۔ سندھ میں سر شاہنواز بھٹو اور سر غلام حسین ہدایت اللہ تھے جن کی اپنی Sindh United Party تھی۔ صوبہ سرحد میں صاحبزادہ عبدالقیوم اپنی جداگانہ پارٹی چلا رہے تھے۔ بہار میں سید عبدالعزیز اور سید حسین امام کی الگ الگ پارٹیاں تھیں۔ آسام میں سر محمد سعد اللہ کی Assam United Party تھی۔ غرضیکہ ہر صوبے کے مسلمان لیڈر Provincial Autonomy کے تصور کے تحت، مرکز سے بے نیاز ہو کر، اپنے اپنے صوبے میں اپنی اپنی جداگانہ پارٹی کے نام پر الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب آل انڈیا مسلم لیگ نے خود ایک پارلیمنٹری بورڈ بنا کر، صوبائی انتخابات میں حصہ لینے اور اپنے ٹکٹ پر ہر صوبے میں امیدوار کھڑے کرنے کا فیصلہ کیا تو مسلم لیگ کا ان تمام صوبائی پارٹیوں کے ساتھ تصادم ناگزیر ہو گیا تھا۔ سر فضل حسین، مولوی فضل الحق، سر محمد یوسف، نواب چھتاری، صاحبزادہ عبدالقیوم، سید عبدالعزیز، سر شاہنواز بھٹو، سر محمد سعد اللہ وغیرہ انفرادی طور پر آل انڈیا مسلم لیگ کے ممبر تھے۔ لیکن آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی الیکشن بورڈوں میں شریک ہونے اور مسلم لیگ کے ٹکٹ پر، اپنے اپنے صوبے کی الیکشن لڑنے کو تیار نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہر صوبے کے حالات مختلف ہیں، جن میں آل انڈیا مسلم لیگ کا دخل دینا قطعی مناسب نہیں اور یوں بھی یہ مصلحت کے خلاف ہے۔ اب یہ تمام لوگ ایک طرح صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں مسٹر جناح کے حریف اور مدمقابل بن گئے تھے

۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء کو بمبئی میں آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اجلاس میں الیکشن بورڈ وضع کرنے کا ریزولیوشن پاس کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک ہفتہ بعد یعنی ۱۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو سر فضل حسین نے یونینسٹ پارٹی کی نئے سرے سے تشکیل و تعمیر کرنے کے لیے، نواب شاہنواز خان والی، ممدوٹ کے مکان پر، جسے عرف عام میں ممدوٹ ولا کہا جاتا ہے، ایک بڑا پر تکلف اجتماع کیا، جس میں پنجاب کے اکثر اضلاع کے نمائندے شریک ہوئے۔ اسی

اجتماع میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ پنجاب اسمبلی کے انتخابات میں یونینسٹ پارٹی اپنے نمائندے کھڑے کرے گی۔ اس جلسے میں پچاس ہزار روپے چندہ بھی جمع ہو گیا، جو اس زمانے کے معیار کے مطابق بہت بڑی رقم تھی۔ اس کے علاوہ بیس ہزار کی رقم ایک ایسے شخص نے دی جسے پنجاب کی یونینسٹ پارٹی سے دور کا تعلق بھی نہ تھا یعنی ہز ہائنس آغا خان نے ممکن ہے آپ میں سے کوئی شخص یہ سوال کرے کہ آغا خان کو یونینسٹ پارٹی سے کیا دلچسپی تھی؟ اس سوال کے جواب میں مجھے ایک لمبی داستان بیان کرنی پڑے گی، جس کے لیے افسوس ہے کہ میرے پاس وقت نہیں۔

۱۹/اپریل ۱۹۳۶ء کو ممدوٹ ولا میں جو پرتکلف اجتماع ہوا تھا اس کی بعض خصوصیتیں مجھے آج تک یاد ہیں۔ اس لیے کہ مجھے بھی اس تقریب میں شرکت کا فخر حاصل ہوا تھا۔ ایک خصوصیت یہ تھی کہ نواب صاحب ممدوٹ نے، جہاں چائے کے ساتھ اعلیٰ درجے کی مٹھائی مہمانوں کی خدمت میں پیش کی تھی۔ وہاں برف میں جمی ہوئی ملائی کی قلفیوں سے بھی ان کے کام و دہن کی تواضع فرمائی تھی، جو اس زمانے میں ایک بالکل نئی بات تھی۔ چنانچہ اگلے ہی روز لاہور کے اخبار "زمیندار" نے ان قلفیوں پر ایک پھڑکتی ہوئی نظم شائع کی تھی۔

دوسری خصوصیت جو مجھے یاد ہے وہ یہ ہے کہ میاں احمد یار خاں دولتانہ نے، سر فضل حسین کی خدمت میں انگریزی میں لکھا ہوا بڑا طویل ایڈریس پیش کیا تھا، جس میں سر فضل حسین کی بے انتہا تعریف کی گئی تھی۔ اور آخر میں میاں صاحب کے محاسن و مکارم اور کمالات و فضائل پر تبصرہ کرتے ہوئے، اقبال کا یہ شعر پڑھا تھا کہ ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

اس واقعے کو اکتیس سال گذر چکے ہیں۔ لیکن سچ پوچھیے، میری حیرانی آج تک رفع نہیں ہوئی کہ آخر اس شعر کا وہاں کیا موقعہ و محل تھا اور پڑھنے والے کا روئے سخن کس کی طرف تھا؛ نشہ پلا کے گرانے والے سے مراد کون شخص تھا اور گرتوں کو تھامنے والا کون تھا؟ یقیناً گاندھی یا نہرو یا جناح کا یہ شیوہ نہ تھا کہ وہ لوگوں کو نشہ پلا کے گرانے کا ارتکاب کریں۔ اور باقی رہا گرتوں کو تھامنے کا سوال۔ سر فضل حسین یقیناً بڑے باکمال اور پختہ کار سیاست دان تھے۔ لیکن بدیہی طور پر ان میں کوئی ایسی بات نظر نہ آتی تھی کہ وہ گرتوں کو تھامنے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔

بہر حال یونینسٹ پارٹی کے دورِ جدید کے افتتاح کا یہ جلسہ دلچسپ ہونے کے علاوہ، سیاسی اعتبار سے بھی بڑا اہم تھا۔ بہت سے لوگ اس جلسے میں ایسے بھی شریک ہوئے تھے، جو یونینسٹ پارٹی کے ممبر نہ تھے اور نہ انہیں یونینسٹ پارٹی کے پروگرام اور طرزِ عمل سے اتفاق تھا۔ مثلاً ملک برکت علی، میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا، رائے بہادر مکند لال پوری بیرسٹر ایٹ لا، سردار اجل سنگھ، لالہ بھگت رام پوری بیرسٹر ایٹ لا، رائے صاحب سوہن لال، مالک فرم

رائے صاحب گلاب سنگھ اینڈ سنز، رائے صاحب لالہ رام جوایا مل کپور، مالک فرم عطر چند کپور اینڈ سنز، کے۔ ایل۔ گابا بیرسٹر ایٹ لا، ڈاکٹر محمد عالم بیرسٹر ایٹ لا وغیرہ۔

سر فضل حسین نے اس جلسے میں یونینسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹر کا افتتاح کرتے وقت ایک بڑی جامع و مانع تقریر کی۔ سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں سے میری درخواست ہے کہ وہ اس تقریر کا ضرور مطالعہ کریں۔ میاں فضل حسین بڑے زیرک، معاملہ فہم، مدبّر اور مسلمانوں کے خیر خواہ لیڈر تھے۔ اس تقریر میں انھوں نے یونینسٹ پارٹی کے طریق کار اور پروگرام کی تفصیل بیان کی تھی اور آخر میں فرمایا تھا کہ پنجاب کو جس قدر ترقی، عروج اور عزت نصیب ہوئی ہے، وہ صرف پانچ آدمیوں کی کوشش، محنت اور قابلیت کا نتیجہ ہے۔ وہ پانچ آدمی کون تھے؟ سنیے! سر سکندر حیات خان، ملک فیروز خان نون، چودھری شہاب الدین، میاں احمد یار خان دولتانہ اور چودھری چھوٹو رام۔ میں سمجھتا ہوں کہ مناسب ہی ہوگا کہ میں سر فضل حسین کی تقریر دلپذیر کا وہ ٹکڑا آپ کو پڑھ کر سنا دوں۔ جس میں ان ارکان خمسہ کی تعریف کی گئی ہے۔ میاں صاحب فرماتے ہیں:

Sir Sikandar has more than once given statements to the Press saying generously that he shall gladly work with me as my sincere and loyal colleague in the Cabinet. This is a compliment which I very much appreciate, and I have never hesitated to express my appreciation of the great services he has rendered to the Party and to the administration of the Province, and my gratifications at the great qualities of leadership and sound administration that he has displayed.

Not only has Sir Sikandar Hayat Khan distinguished himself but there are also other colleagues of mine who have established that, given the chance, they can show great *initiative*, *enterprise*, *independence*, and *efficiency*. For example, my friend, Rao Bahadur Chaudhri Chhotu Ram, did excellent work as Minister and his work as the leader of the Unionist Party is unsurpassed by any leader of a party in any of the Provincial Legislatures. *The ability*, *industry*, *sincerity*, *enthusiasm*, *perseverance*, *persistence*, *courage* and *independence*, all of which he Possesses in pre-eminent degree, have won him the gratitude of every member of the Party.

My second colleague, Sir [illegible]ze Khan Noon, has done remarkbly good work which stands second to none amongst the Ministers who have held office in Indian Provinces, while our President—he is simply marvellous. What dignity, what self-confidence, what autocracy! He reminds one of the autocrats of the 17th century. May he live long to rule over the destinies of our Legislatures.

My young friend, Khan Bahadur Mian Ahmad Yar Khan Daulatana, has been literally brought up by me. Some of you may find fault with him for his generosity, his occasional

exuberance of spirits, but he has rendered a very great service to our Party and I very largely depend upon him for making this great enterprise a success. I look to him to make tHis lost great effort of mine successful. His failure, God forbid, whill be my failure and his success is my success"

سرفضل حسین کی یہ تقریر، اس لحاظ سے ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے کہ یہ ان کی زندگی کی آخری تقریر ہے۔ ۱۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو انھوں نے یونینسٹ پارٹی کے دور جدید کا افتتاح کرتے وقت یہ تقریر کی اور تقریباً ڈھائی مہینے بعد یعنی ۹ جولائی کو ان کا انتقال ہو گیا۔

اس تقریر سے عیاں ہے کہ سرفضل حسین کو پورے پنجاب میں کام کے صرف پانچ آدمی نظر آتے تھے۔ یعنی سرسکندر حیات خاں، چوہدری شہاب الدین، ملک فیروز خاں نون، چوہدری چھوٹو رام اور احمد یار خاں دولتانہ۔ باقی پورا پنجاب جو ڈیرہ غازی خاں سے لے کر حصار تک پھیلا ہوا تھا، گویا ان کے نزدیک ایک لق و دق صحرا تھا جس میں کوئی پڑھا لکھا، موزوں، سمجھدار اور کام کرنے کے قابل آدمی موجود نہیں تھا۔

مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی مشہور کتاب آب حیات میں ایک لطیفہ درج کیا ہے کہ ایک دفعہ کسی شخص نے میر تقی میر سے پوچھا کہ حضور! آج ہندوستان میں کتنے شاعر ہیں؟ میر صاحب نے جواب دیا "ڈھائی"! پوچھنے والے نے پھر سوال کیا کہ یہ ڈھائی شاعر کون کون ہیں۔ تو میر صاحب نے فرمایا کہ ایک میں، دوسرے مرزا سودا اور آدھے میر درد سوال کرنے والے شخص نے عرض کیا کہ میر سوز بھی تو آخر شاعر ہیں۔ وہ نواب آصف الدولہ کے استاد ہیں۔ اس پر میر صاحب نے چیں بہ جبیں ہو کر فرمایا، بہت اچھا، ان کو بھی پاؤ شاعر مان لیتا ہوں۔ گویا میر تقی میر کے نزدیک پورے ہندوستان میں صرف پونے تین شاعر تھے۔ اسی طرح سرفضل حسین جیسے دیدہ ور، مردم شناس، روشن خیال اور بصیرت و بصارت کے مالک شخص کی نگاہ میں صرف یہ پانچ آدمی تھے جو ہماری درماندہ قوم اور ہمارے پس ماندہ ملک کو غلامی سے نجات دلانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان پانچوں میں سے چار تو اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، صرف ملک فیروز خان نون، تام خدا، باقی ہیں۔

سرفضل حسین نے یونینسٹ پارٹی ۱۹۲۳ء میں قائم کی تھی۔ جس کی ہیئت ترکیبی یہ تھی کہ لوگ اپنے اپنے ذاتی اثر اور رسوخ سے منتخب ہو کر پنجاب کونسل میں آتے تھے اور ایوان کے اندر باہمی افہام و تفہیم سے ایک پارٹی بنا لیتے تھے۔ یونینسٹ پارٹی کے پروگرام کی بنیادی شق یہ تھی کہ زراعت پیشہ مسلمان اور زراعت پیشہ ہندوؤں کے اشتراک سے پنجاب کی زراعت پیشہ آبادی کو شہری ہندوؤں کے اس دولت مند طبقے کے ابتلا سے جو ذرائع آمدنی کے علاوہ سرکاری ملازمتوں پر بھی قابض ہو چکا تھا، محفوظ رکھا جائے۔

پنجاب لیجسلیٹو کونسل سے باہر یونینسٹ پارٹی کا کوئی وجود نہیں تھا۔ نہ کبھی اس پارٹی نے آئینی اور دستوری معاملات میں ہندوؤں یا مسلمانوں یا سکھوں کی رہنمائی کی اور نہ کبھی عوام میں کوئی شخص اس پارٹی کا ممبر بنا۔ میاں فضل حسین نے اب ۱۹۳۶ء میں پہلی مرتبہ یونینسٹ پارٹی کو ایک عوامی ادارے کا رنگ دے کر اور اسے ایک Electioneering Party بنا کر اس کے نام پر الیکشن کی جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

مصیبت یہ تھی کہ طریق انتخاب جداگانہ تھا اور ہندو امیدوار ہندوؤں سے اور مسلمان امیدوار مسلمانوں سے ووٹ مانگتے تھے۔ ان حالات میں میاں فضل حسین کا یہ اقدام کہ ایک نام نہاد اقتصادی پروگرام کی بنا پر، ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں کی کسی مخلوط پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات میں حصّہ لیا جائے، ایک ایسا معنوی تضاد تھا جس کو جداگانہ انتخاب کے اصول کے ساتھ کسی طرح منطبق نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میاں صاحب بلاشبہ بڑے ذہین اور مدبر اور حالات زمانہ سے واقف شخص تھے۔ لیکن امر واقع یہ ہے کہ وہ ۱۹۲۱ء سے مسلسل حکومت سے وابستہ چلے آ رہے تھے اور پندرہ سال تک حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہنے کے بعد ان کا عوام سے براہِ راست کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ وہ یہ حقیقت سمجھنے سے معذور تھے کہ ترک موالات اور سول نافرمانی کی وسیع تحریکوں نے ہندوستان کی نئی نسل کو کس طرح نئے راستوں پر ڈال دیا تھا اور مسلمانوں کا نوجوان طبقہ کس اضطراب کا شکار ہو رہا تھا۔

جس وقت میاں فضل حسین یونینسٹ پارٹی کی تشکیل جدید کے ان منصوبوں میں مصروف تھے، ان کے پرانے اور عزیز دوستوں میں صرف دو آدمی ایسے تھے جنہوں نے میاں صاحب کے اس طرز عمل اور سیاسی پروگرام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ایک علامہ اقبال تھے اور دوسرے ملک برکت علی۔ اقبال اور فضل حسین پرانے دوست تھے۔ دونوں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ دونوں نے اکٹھے ایک ہی سال میں بی۔اے۔ پاس کیا تھا۔ دونوں سر ٹامس آرنلڈ کے حلقۂ تلمذ میں شریک رہے تھے۔ اقبال اور فضل حسین میں کوئی حریفانہ چپقلش نہ تھی۔ اقبال کی ساری عمر قلندری میں بسر ہوئی تھی۔

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی، کبھی پیچ و تاب رازی

جن لوگوں نے بانگ درا پڑھی ہے انھیں معلوم ہو گا کہ اقبال نے ایک بے مثال نظم، فلسفہ غم، میاں فضل حسین ہی کے پاس خاطر سے لکھی تھی۔ اس لیے یہ ہرگز خیال نہ کرنا چاہیے کہ اقبال نے کسی قسم کے جاہ و منصب کے حصول کے خیال سے فضل حسین کے خلاف قدم اٹھایا تھا۔ جو لوگ اقبال کی بے نیازی اور قلندری سے واقف ہیں انھیں معلوم ہے کہ جب انھیں مہینے میں چھ، سات سو روپے کے مقدمے مل جاتے تھے تو وہ آئندہ کوئی مقدمہ نہیں

لیتے تھے اور کہتے تھے کہ اگلے مہینے کے رزق کا خدا مالک ہے۔ اسی اقبال نے میاں فضل حسین کی سرگرمیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ۱۹۳۶ء میں کہا تھا:

It is really unfortunate that the rural-urban question should have received the support of Sir Fazl-i-Husain who obtained power in the first instance, not as a rural leader but as a Muslim leader of the Province, but unfortunately clung to his power by accentuating rural-urban differences. In this way, he secured as his colleagues some third-class men with no title to Government power and the prestige and authority which the possession of such offices as ministerships secure, but who on that very account, viz, their mediocrity, look up to him as superman. Some of the authorities also encouraged this policy as in this way they were able to break the force of the Reforms of 1919. The result of these tendencies has been that so far as the Muslims are concerned, real leadership has stood at a distance while the thoroughly incompetent "political adventure" has come into the limelight."

پنجاب کی اس سیاست کے متعلق، جس کا محور اور مرکز میاں فضل حسین تھے، یہ اقبال کا فیصلہ تھا جو آپ نے سن لیا۔ اب میں سر فضل حسین کے ایک اور دوست ملک برکت علی کا کچھ ذکر کروں گا۔ ۱۹۱۵ء میں، جب میاں فضل حسین نے سر محمد شفیع کے مدمقابل بن کر پنجاب میں ایک نئی پراونشل مسلم لیگ قائم کی اور اس صوبے میں ترقی پسند سیاست کا دروازہ کھولا، تو جن گنے چنے افراد نے میاں صاحب کا اس مہم میں ساتھ دیا تھا، ان میں ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین، پیر تاج الدین اور غلام رسول خاں پیش پیش تھے۔ اور انہی چار آدمیوں کے کندھوں پر سوار ہو کر سر فضل حسین نے ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک کے عرصے میں اپنی لیڈری کی عمارت استوار کی تھی۔

۱۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو، جب ممدوٹ ولا میں یونینسٹ پارٹی کے دور جدید کا افتتاح ہوا تھا اور جس جلسے کا حال میں نے ابھی بیان کیا ہے، اس سے دو ہفتے بعد ملک برکت علی نے سر فضل حسین کو ایک خط لکھا ہے جو یقیناً اس قابل ہے کہ اس کا کچھ حصہ میں آپ کو پڑھ کر سناؤں۔ اقبال کی رائے تو آپ سن چکے۔ اب سر فضل حسین کے ایک اور دوست ملک برکت علی کی رائے ملاحظہ فرمایئے۔ ملک صاحب لکھتے ہیں۔

You said that the Province had lost a great deal in its self-respect and that the first question confronting any public man was how to restore to the Province the self-respect it has lost. No bitter truth could be so beautifully and aptly expressed. May I venture to add that the guilt of this crime against the Province rests on the shoulders of the Unionist Party that you left to take charge of the affairs of the Province after you had gone to Delhi. They were the party in power and the grave responsibility of playing with and bartering away the self-respect of the Pronvince, rests solely with them and them alone. You have chosen the same party as your instrument. It may be that you can control the situation.

but for how long? After you, who will carry out your work? Will it be the Noons and the Sikandars? It is a pain to us that some of these creatures of yours should actually be conspiring against you and plotting and cajoling with Hindus to overthrow you. The "Eastern Times" announces that Sir Sikandar has accepted your leadership. But the "Tribune" tells another tale. Who is this Sir Sikandar?

Mian Sahib ! You should open your eyes, and rally to yourself the talent of the Province—those whom you cast out and who have been passing their time in the wilderness. It is only the talent of the Province that can face an imperialist. Governor. You belonged to that circle of talent. The Province gained in self-respect while you were at the helm. But what of your successors, and yet you have been full of praises for their "magnificent work" ? We expect of you to help Talent coming back into its own. These Sikandars and Noons must disappear. The sooner they are relegated to the back places they deserve, the better. The responsibility for this situation is yours . . . . The Sikandars and the Noons and the rural leaders—the favourites of the bureaucracy—can be washed away in no time; you are their prop and mainstay. Are you aware of it ? If not, I have taken the liberty of apprising you with it so that it may not be said that no friend has opened his heart to you.

You have not been fair to us. We have kept up our regard and esteem for you, and have virtually retired from the field of public service. But what youthful heart is there which does not pine at the meagreness of the opportunity to serve and advance his province under the awful conditions that your leadership has brough about ? Iqbal is finished, poor Shah Nawaz is pastime; Shuja gone; the only ones that thrive are the Sikandars and the Noons and Sir Shahab.

Who else can aspire at all, under the conditions and under the terrible handicaps that exist to-day. Thanks to your Unionist Party and its cult, despite all creeds and programmes.

یہ اُس ملک برکت علی کی رائے ہے جنھوں نے اس وقت میاں فضل حسین کا ساتھ دیا تھا جب پنجاب میں سر مائیکل اوڈوائر کی حکومت تھی اور جب شاہ پور کے ٹوانے اور نون اور اٹک کے کھٹڑ اور ملک ڈر کے مارے فضل حسین کے قریب بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

پنجاب اور اہل پنجاب کی تقدیر سر سکندر حیات خاں اور ملک فیروز خاں نون کے حوالے کر کے میاں فضل حسین اپریل ۱۹۳۰ء میں دہلی تشریف لے گئے تھے تاکہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کو اپنی شرکت سے سرفراز فرمائیں پانچ سال وہاں گزار کر جب وہ واپس لاہور آئے، تو پنجاب کی جو حالت ان کی غیر حاضری میں ان کے رفقائے عالی مقام کے ہاتھوں ہو چکی تھی، اس پر میں اپنی طرف سے کوئی تبصرہ یا محاکمہ کرنا بے کار سمجھتا ہوں۔ اس بارے میں خود سر فضل حسین کی اپنی رائے سن لیجیے جو انھوں نے ۱۹۳۵ء میں دہلی سے واپس آ کر ظاہر فرمائی تھی۔ وہ رائے یہ ہے :

Government policy is responsible for there being no leader in the community. As soon as Government officials find an Indian wielding influence, their tendency is to counteract his influence. This has come to be Government policy. In the case of Hindus, the excuse was that they are *Congresswallas*, and so opposed to Government. In the case of Muslims, when there is no excuse, resort is had to underhand programme so as to prevent the community from developing strength which unity brings. Sectarianism is encouraged. Personal factions created, encouraged and developed, and when they do not help, recourse is taken to encouraging the leaders of the scum of society to create diversions by undermining the influence of leaders. And what is the result ? Government has freedom of action—can do what it likes, but if things do not work out as desired by them, there is no one to help them. Members and Ministers cannot be really useful if their position is no better than that of glorified Tehsildars to do the bidding of the Governor. What following, what party, what school of thought ?

ملاحظہ فرمایا آپ نے ۔ ایک طرف سرفضل حسین کی رائے یہ ہے کہ پنجاب کے وزیروں کی حیثیت گرتے گرتے تحصیلداروں کے برابر ہوگئی ہے، جو گورنر کے اشارے پر ناچتے ہیں۔ اور دوسری طرف کیفیت یہ ہے کہ جب انھوں نے ۱۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو یونینسٹ پارٹی کے دور جدید کا افتتاح کیا تھا تو اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ پنجاب کو آج تک جس قدر ترقی، جس قدر عروج اور جس قدر سربلندی حاصل ہوئی ہے، وہ صرف پانچ آدمیوں کی کوشش کا ثمر ہے اور ان پانچ آدمیوں میں سب سے آگے سر سکندر حیات خاں اور ملک فیروز خاں نون کے نام نامی اور اسم گرامی تھے اور ان دونوں کے ہاتھ میں پنجاب کی تقدیر تھی ۔ ان میں سے ایک پنجاب کی ایگزیکٹو کونسل میں ریونیو ممبر تھے اور دوسرے وزیر تعلیم:

میر درد کا ایک شعر ہے ۔

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا !